علامہ میمنی کا علمی مرتبہ

محمد محمود میمن

والد محترم علامہ عبدالعزیز میمن مرحوم عربی کے ایک متبحر عالم، عظیم محقق، بلند پایہ ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ ان کی شخصیت عربی سے تعلق رکھنے والوں کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ پاک و ہند سے جو کوئی عرب ممالک جاتا تھا اور وہاں اس کا واسطہ عربی کے طلباء، علماء، فضلاء یا محققین سے پڑتا تھا تو یہ حضرات سب سے پہلے اس سے یہ سوال کرتے تھے کہ کیا آپ "استاذ المیمنی" کو جانتے ہیں اور یہ کہ وہ کیسے ہیں۔ یہ سب حضرات ان کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی وجہ سے ان سے غائبانہ طور پر بخوبی واقف ہوتے تھے۔ ان کی اس جستجو سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عرب ممالک کے علماء اور فضلاء کے دلوں میں ان کا کیا مقام تھا اور یہ کہ ان کی شہرت پاک و ہند کی سرحدوں سے کتنی دور تک جا پہنچی تھی۔ افسوس کہ ان کی رحلت سے برصغیر ہی نہیں بلکہ سارا عالم عرب ایک عظیم محقق، مبصر اور عربی دان سے محروم ہو گیا۔ ان جیسی عالی مرتبت شخصیتیں تو کہیں صدیوں میں جنم لیتی ہیں۔ اگر ہم موجودہ حالات، تعلیمی نظام اور مدارس کا جائزہ لیں تو مشکل ہی نظر آتا ہے کہ یہ عہد ان کے پایہ کی کسی علمی شخصیت کو جنم دے سکے۔

والد محترم علامہ عبدالعزیز میمن بن حاجی عبدالکریم ۱۸۸۸ء میں بمقام گونڈل (ہندوستان) پیدا ہوئے۔ دادا حضور بہت عبادت گزار اور دیندار آدمی تھے۔ شادی سے قبل ہی انہوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنی پہلی اولاد نرینہ کو دینی تعلیم اور عربی زبان کے لئے وقف کر دیں گے۔ چنانچہ والد محترم نے اپنی ابتدائی تعلیم راجکوٹ میں حاصل کی جہاں دادا حضور رہائش پذیر تھے۔ کچھ عرصہ جوناگڑھ میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد غالباً ۱۹۰۱ء میں دادا حضور نے انہیں مزید تعلیم کے لئے اپنے

ہمراہ دہلی بھیج دیا۔ ان دنوں دہلی علوم اسلامیہ کا ایک بڑا مرکز تھا۔ بڑے بڑے علماء، فضلاء اور ادبا وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اپنی عربی کی تعلیم اس وقت کے مروجہ طریقہ پر مساجد اور دینی مدارس میں حاصل کی۔ انہیں بڑا اشتیاق تھا کہ سید نذیر حسین محدث دہلویؒ سے شرف تلمذ حاصل ہو مگر افسوس کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اس لئے کہ غالباً ۱۹۰۳ء کے اوائل ہی میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے تھے۔

والد محترم نے بخاری شریف اور صحیح مسلم مولوی عبدالرحمٰن پنجابی سے پڑھی جو خود ایک ممتاز محدث اور صرف ونحو کے ماہر تھے۔ ترمذی جہاں تک انہیں یاد تھا مولوی عبدالجبار عمرپوری سے پڑھی۔ بقول والد محترم اس وقت کے حدیث کے علماء میں جید ترین عالم مولانا محمد بشیر سہسوانی تھے ان سے انہوں نے ابوداؤد شریف پڑھی۔ طالب علمی کے آخری دور میں انہیں مولوی ڈپٹی نذیر احمد کی شاگردی کا بھی شرف حاصل ہوا جو عربی علم وادب کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ ان سے حماسہ، متنبی، مقامات اور سقط الزند پڑھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اپنی فارسی اور اردو کی استعداد کے سبب بھی بہت ممتاز تھے۔ بقول والد محترم وہ اُردو ترجمہ اس قدر خوبصورت کرتے تھے کہ جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ والد محترم فرماتے تھے کہ جس استاد کی تعلیم سے انہوں نے عملاً سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا وہ مولوی عبدالرحمٰن پنجابی کی ذات بامصفات تھی جو دہلی میں حاجی علی جان کی مسجد میں جو گھنٹہ گھر کے قریب تھی درس دیا کرتے تھے۔ وہ مزید فرماتے تھے کہ انہوں نے جس محبت اور شفقت سے انہیں تعلیم دی اس کا احسان وہ زندگی بھر نہ بھولیں گے۔ ان کے حالات کے ذیل میں امام خاں نوشہروی نے جو "تاریخ علمائے حدیث ہند" میں حالات لکھے ہیں اس کا ایک جملہ یہاں تحریر کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالرحمٰن کے بے انتہا شاگرد ہیں مگر سب سے بڑا شرف اور سب سے بڑی منقبت ان کی یہ ہے کہ علامہ عبدالعزیز میمن ان کے خاص شاگرد ہیں اور اس پر وہ جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔"

دہلی میں قیام کے دوران جب والد محترم کی عمر سترہ، اٹھارہ سال تھی تو اس وقت انہوں نے شیخ حسین بن محسن الانصاری سے حدیث کی سند حاصل کی جو شیخ نے اپنے قلم سے تحریر کر کے ان کو "علامہ عبدالعزیز الولد العزیز" کے لقب کے ساتھ عطا کی۔ اس طرح سے انہوں نے حدیث کے

ایک عظیم امام محمد ابن علی شوکانی کے ساتھ اپنا سلسلہ قائم کیا۔ یہ سند، علمائے حدیث کی نظر میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ وفات کے وقت وہ آخری بقید حیات شخص تھے جن کے پاس یہ سند تھی۔ ۱۹۰۸ء میں وہ دہلی سے امروہہ تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے فقہ کی خصوصی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۰ء میں وہ رامپور چلے گئے اور وہاں انہوں نے محمد طیّب مکّی استاد حکیم اجمل خاں، مولوی عبدالعزیز صاحب استاد نواب رامپور اور مولوی فضل حق صاحب صدر مدرس مدرسۂ عالیہ رامپور سے فلسفہ اور منطق کی تعلیم حاصل کی۔ رامپور ہی کے قیام کے دوران انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۱۱ء میں منشی فاضل اور ۱۹۱۳ء میں مولوی فاضل کے امتحانات بحیثیت پرائیویٹ امیدوار کے دیئے اور ہر دو امتحانات میں تو انہوں نے ریکارڈ بھی قائم کیا جو بقول ان کے چالیس سال تک قائم رہا۔

والد محترم کی تصانیف جہاں تک میرے علم میں ہے تیس کے لگ بھگ ہیں اور ان میں سے زیادہ تر کتب مصر، شام اور دیگر اسلامی ممالک سے شائع ہوئیں۔

علی گڑھ کے قیام کے زمانے کا ان کا مایہ ناز تحقیقی کارنامہ ان کی کتاب 'سمط اللآلی' ہے جو مصر سے شائع ہوئی۔ اس کا تعلق ابو علی القالی کی کتاب 'الآمالی' سے ہے۔ اس کی شرح ابو عبید البکری نے اللآلی کے نام سے پانچویں صدی ہجری میں لکھی تھی جو بہت نایاب ہے۔ والد محترم نے اس کے بہت سے نسخے جمع کئے، تقابلی مطالعہ کیا اور موازنہ و تصحیح کے بعد ایک نسخہ ترتیب دیا اور اس پر حواشی لکھے اور خود قاہرہ جا کر ۱۹۳۵ء میں اسے شائع کرایا۔ یہ ان کی محبوب ترین کتاب ہے اور وہ اس کو نوادر لغات و اشعار کا بہترین ذخیرہ سمجھتے تھے۔ ان کی اس کتاب نے شائع ہوتے ہی عرب دنیا میں ہل چل مچا دی اور اس کے سبب عربی لغت اور ادب میں علمائے عرب اور محققین زبان سے انہوں نے اپنے عمیق مطالعہ اور تحقیق کا لوہا منوایا اور اسی کتاب کی بدولت وہ عرب دنیا سے روشناس ہوئے اور انہیں عربی زبان و ادب کا امام تسلیم کیا جانے لگا۔

ان کی دوسری معرکۃ الآرا کتاب جو انہوں نے اپنے لاہور کے قیام کے دوران تصنیف کی اور مصر سے شائع کرائی 'ابو العلاء و ما الیہ' ہے۔ مصر کے مشہور عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو عرب کے نامی گرامی شاعر

اور فلسفی ابو العلاء المعری پر سند مانا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ان کو جسمانی، ذہنی اور کئی دوسرے طریقوں سے بھی کافی مناسبت تھی۔ ان کی کتاب 'ذکری ابی العلاء' جب چھپی تو اسے عرب دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مگر جب والد محترم کی کتاب ابو العلاء و ما الیہ شائع ہوئی تو اس نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی 'ذکری ابی العلاء' کو پیچھے ڈال دیا۔ مصر کے عظیم علماء و فضلاء مثلاً مرحوم احمد تیمور پاشا، شیخ محمد خضر الیتونسی احمد الاسکندری اور احمد شاکر اور بہت سے دوسرے حضرات نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "بہترین کتاب جو کبھی لکھی گئی"۔ شام کے مشہور عالم علامہ کرد علی نے "المجمع العلمی العربی" کے مجلہ کے ایک شمارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا "یہ سب سے عمدہ کتاب ہے جہاں تک تحقیق کا تعلق ہے"۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین الفاظ اور طرز تحریر کے ماہر تھے مگر ان کو کرم خوردہ نسخوں کی تصحیح و مقابلہ، روایات اور بیانات کے تقابل و ترجیح اور اغلاط و فروگذاشتوں کی تصحیح پر قدرت نہ تھی۔ اس کام کے لئے بینائی، فہم، حیرت انگیز اور غیر معمولی یادداشت، لگن اور سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے ان اوصاف کی ڈاکٹر طٰہٰ حسین مرحوم میں اپنی تمام خوبیوں اور کمالات کے باوجود کمی تھی اور والد محترم میں یہ سب باتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

ان کا تیسرا نمایاں تحقیقی کام 'الوحشیات' ہے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے شاعر ابو تمام کے کلام کی ضروری تصحیح کی اور اسے مرتب کر کے شائع کرایا۔ ان کا یہ کام کراچی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

خزانۃ الادب (عبدالقادر لبغدادی) کا انڈکس 'اقلید الخزانہ' کے نام سے شائع کرایا۔

امام عبدالقاہر الجرجانی نے ابو تمام اور متنبی کے دواوین کا انتخاب 'الطرائف الادبیہ' کے نام سے کیا تھا اسے بھی انہوں نے حواشی اور ضروری تشریحات کے ساتھ المختار من شعر المتنبی و البحتری و ابی تمام للامام عبدالقاہر الجرجانی، کے نام سے شائع کرایا۔

ابو تمام کا دیوان الحماسۃ الصغری، اور علی حمزہ بصری کی 'التنبیہات علی اغالیط الرواۃ' شائع کیں۔

ان چھ کتابوں کے علاوہ ان کی دیگر تالیفات جن کا مجھے علم ہو سکا وہ مندرجہ ذیل ہیں: (۷) زیادات دیوان شعر المتنبی' (۸) دیوان حمید بن ثور (۹) دیوان سحیم' (۱۰) الانفاضل للمبرد' (۱۱) المقصور و الممدود

دلابن ولاد (۱۲) نسب عدنان و قحطان (۱۳) ثلاث رسائل نادرة (۱۴) تکملة دیوان ابن عنین (۱۵) الفائت من شعر المتنبی (۱۶) المنتقف من شعر ابن رشیق و ابن شرف (۱۷) المداخلات للمطرز غلام ثعلب (۱۸) فہارس سمط اللآلی (۱۹) تسع قصائد نادرة (۲۰) المباحث العلمیة (۲۱) ما اتفق لفظہ و اختلف معناہ من القرآن المجید (۲۲) رسالة الملائکة (۲۳) ابواب مختارة من کتاب ابی یوسف یعقوب بن اسحاق الاصبہانی (۲۴) کتاب التصحیف (۲۵) کتاب الانواء (۲۶) دیوان الافوہ الاودی (۲۷) دیوان الشنفری (۲۸) دیوان ابراہیم بن العباس الصولی اور (۲۹) کتاب لحن العامہ

والد محترم نے کافی تعداد میں مقالے پڑھے اور مضامین لکھے جو بین الاقوامی شہرت کے علمی جریدوں میں شائع ہوئے۔ پشاور میں ملازمت کے دوران جو غالباً ۲۰-۱۹۱۴ء کا زمانہ تھا عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر ان کے مضامین لاہور کے ادبی رسالے مخزن میں شائع ہوئے۔ لاہور میں قیام کے دوران (۲۵-۱۹۲۱ء) اورینٹیل کالج میگزین میں مختلف موضوعات پر ان کے مضامین چھپے۔ علی گڑھ کی ملازمت کے زمانہ میں جو ۵۱-۱۹۲۶ء تک محیط تھا ان کے مضامین مختلف رسائل اور جریدوں میں چھپتے رہے مثلاً معارف (اعظم گڑھ) برہان (دہلی) الندوہ (لکھنو) اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) مجلہ المجمع العلمی العربی (دمشق) الزہرة (مصر) وغیرہ وغیرہ۔ ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے انعقاد کے سلسلے کے تیسرے اجلاس میں جو دسمبر ۱۹۳۸ء میں دہلی میں منعقد ہوا تھا انہوں نے ایک مقالہ کتاب اسماء جبال تہامہ و سکانہا و مافیہا من القری و ماینبت علیہا من الاشجار و ما فیہا من المیاہ کے عنوان سے پڑھا جو اس جلسے کی طبع شدہ روداد میں موجود ہے۔ ۱۹۴۰ء میں میری محسن کتابیں کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع ہوا تھا۔ اس میں نومبر ۱۹۴۱ء کے شمارے میں ان کا بھی ایک نہایت فاضلانہ اور ذہانت سے بھرپور مضمون شائع ہوا جو عربی سے شغف رکھنے والے طلباء ہی کے لئے نہیں بلکہ فضلاء کے لئے بھی معلومات کا خزانہ ہے۔ معارف (اعظم گڑھ) میں ابوالعلاء و ماالیہ اور اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) میں المفضلیات پر ان کے مضامین چھپے ہیں۔ مجلہ المجمع العلمی العربی دمشق میں انہوں نے یاقوت الحموی کی معجم الادباء پر تبصرہ لکھا جو کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ ان کا ایک مضمون بعنوان ابوعمر الزاہد مجلہ المجمع العلمی الہندی علی گڑھ

(ہندوستان) میں ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ شاید یہ والد محترم کا طبع شدہ آخری مضمون ہو۔

والد محترم حیرت انگیز اور قابل رشک یادداشت کے مالک تھے اور علمائے سلف کا نمونہ تھے۔ انہیں تقریباً ایک لاکھ سے زائد اشعار زبانی یاد تھے۔ دیوان متنبی اور دیوان حماسہ تقریباً مکمل حفظ تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف ان کے بہت سے دوستوں اور مداحوں نے اپنی محفلوں اور تحریروں میں بھی کیا ہے۔ اکثر حضرات ان کے پاس تحقیق کے سلسلے میں حاضر ہوتے تھے تو وہ ان کو کتابوں، نادر قلمی نسخوں اور دستاویزات کے عنوانات معہ ان کے مصنفین اور مولفین کے نام اور ایڈیشن اور دنیا کی کن کن لائبریریوں میں وہ دستیاب ہیں بتلایا کرتے تھے۔ نادر قلمی نسخوں کے حوالہ جات پر انہیں غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ والد محترم ۱۹۳۵ء، ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۸ء میں اسلامی ممالک کے دورہ پر تشریف لے گئے۔ ایران، فلسطین، شام، عراق، ترکی، تیونس اور مراکش میں وہاں کے علما اور فضلا سے ملاقاتیں کیں اور لائبریریاں کھنگالیں، نادر قلمی نسخوں کا مطالعہ کیا اور ان سے خوب خوب استفادہ کیا۔ وہ برصغیر سے المجمع العلمي العربي (دمشق) کے سب سے پرانے اور نمایاں رکن تھے۔ ان سے قبل صرف دہلی کے حاذق الملک حکیم اجمل خان مرحوم کو یہ اعزاز حاصل رہا اور ان کی سند بھی وہ اپنے ہمراہ عرب ممالک کے دورے سے واپسی پر اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کے متعلقین کے حوالے کی تھی۔ المجمع العلمي العربي کی رکنیت ایک بہت بڑا ادبی اعزاز ہے جو بہت ہی نمایاں مستشرقین اور مشرقی علما اور فضلا میں سے کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ والد محترم کے مضامین بڑے آب و تاب اور بڑی باقاعدگی کے ساتھ اس ادارے کے مجلے میں شائع ہوتے تھے اور ان کا اپنا ایک مقام ہوتا تھا اور یہ مضامین عربی کے شیدائیوں کو زبان کے مطالعے کے اچھے اور نادر مواقع فراہم کرتے تھے۔ والد محترم چوٹی کے علما کے ساتھ علمی مباحثوں میں اپنے مطالعے اور تحقیق کے سبب بہت جلد محفل پر چھا جاتے تھے اور اپنی قابلیت اور عربی دانی کا لوہا منوا لیتے تھے۔ ایک نہیں ایسے بہت سے واقعات ہیں جن کا تذکرہ ان کے احباب اور معتقدین نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

جمیل الدین عالی نے روزنامہ "جنگ" مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۸۰ء میں والد محترم کے سلسلے میں اپنے

تجربات کا اظہار اس طرح سے کیا ہے علامہ شبیبی وائس چانسلر بغداد یونیورسٹی اور وزیر تعلیم عراق نے پروفیسر محمد شریف مرحوم اور میر خلیل الرحمٰن کی موجودگی میں مجھ عاجز سے ایک بات کہی۔ یہ ۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے۔ ہم پاکستانی وفد کے اراکین تھے اور جنرل کریم قاسم کی دعوت پر بغداد گئے تھے۔ بڑے عشائیے میں علامہ شبیبی سے ملاقات ہوئی تو بولے ہم عراقی پاکستان کو اسلامی برادری کا ایک اہم رکن سمجھتے ہیں (وغیرہ وغیرہ) مگر معاف کیجئے میں پاکستان پر بڑا رشک کرتا ہوں۔ حضرت وہ کیوں! فرمایا۔ عربی زبان اور قدیم عربی کے سب سے بڑے ماہر علامہ میمن راجکوٹی آپ کے پاس ہیں۔ پوری دنیائے عرب میں ایسا کوئی آدمی نہیں بھئی میں تو پاکستان کو دراصل علامہ میمن کے حوالے سے جانتا ہوں۔

عالی صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں۔ "شیخ الازہر شیخ محمد شلطوت کے ایک شاگرد پروفیسر سید بدادی امریکہ میں میرے ساتھ تھے۔ ایک دن سنایا کہ ایک مجلس میں ایک قدیم محاورے پر بحث تھی۔ مراکش سے ایک بڑے استاد آئے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے شیخ کی بات نہ مانتے تھے۔ جونیئر اساتذہ حیران کہ ہمارے شیخ کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ مگر مراکشی بزرگ کا پلّہ بھاری پڑتا نظر آتا تھا۔ یکایک شیخ شلطوت اٹھے اور اپنی لائبریری کی طرف گئے۔ ایک کتاب لائے بیٹھ کر ایک صفحہ نکالا اور مراکشی بزرگ کے سامنے بڑھا دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے کتاب الٹ کر مصنف کا نام پڑھا۔ پھر ایک دم وہ ورق دیکھا اور لمحہ بھر میں آنکھیں نیچی کر لیں۔ الحمدللہ۔ انہوں نے کہا۔ یا شیخ میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ علامہ میمنی نے یوں بتایا ہے تو درست ہی بتایا ہوگا۔ ہم لوگوں نے پریشان ہو کر اپنے شیخ سے پوچھا۔ آپ عرب ہو کر ان سے سند لائے ہیں۔ فرمایا۔ ان کی نظر سے ایک لاکھ کے قریب تو مخطوطات گزر چکے ہیں۔ عزیزو! یاد رکھنا علامہ میمنی اس زمانہ میں عربی زبان کے سب سے بڑے آدمی ہیں"۔

والد محترم کے یورپی مستشرقین اور عالم عرب کے بیشتر علماء اور فضلاء سے گہرے اور ذاتی مراسم تھے۔ مثلاً برطانیہ کے ڈاکٹر ایف کرینکو جرمنی کے ڈاکٹر اوٹو اسپیس شام کے علماء میں سلفی عالم شیخ محمد بہجت بیطار، مشہور عالم استاد محمد المبارک، فاضل ادیب علامہ کرد علی، مصر کے عبدالوہاب عزام بے، مراکش کے شیخ محمد العربی اور عرب کے علامہ خیرالدین زرکلی۔ ان میں سے اکثر حضرات ادبی تحقیق کے سلسلے میں

ان سے رجوع بھی کرتے تھے۔

والد محترم نے نوے سال اس دار فانی میں گذارے۔ حالانکہ وہ اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکے تھے لیکن پھر بھی اس وقت تک عربی زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے جب تک قوائے جسمانی نے ان کا بالکل ساتھ نہ چھوڑ دیا۔ وہ کراچی میں ۲۶ - ۲۷ / اکتوبر کی درمیانی شب بوقت ساڑھے تین بجے بروز جمعہ (۲۷/ اکتوبر ۱۹۷۰ء بمطابق ۲۳/ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ) اس دار فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تصانیف و تالیفات کی صورت میں جو انہوں نے عظیم الشان ادبی کام اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ رہتی دنیا تک ان کے نام کو کبھی فراموش نہ ہونے دے گا اور عربی کے عظیم ادباء کی فہرست میں ان کے لئے ایک عزت کا مقام حاصل کرے گا۔ وہ ایک مستند استاد و محقق اور کہنہ مشق نقاد و مورخ تھے جن کی عظیم شخصیت سے پاکستان کو عزت و شرف حاصل ہوا اور آج وہ اپنی رحلت کے بعد خود بھی تحقیق کا ایک اچھوتا موضوع بن گئے ہیں۔